سوال

(84) روح سنت

جواب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

روح سنت

(غلام محمد اللہ جرمن)

الجواب بعون الوہاب بشرط صحة السؤال

وعلیکم السلام ورحمة اللہ وبرکاته!

الحمد لله، والصلاة والسلام علىٰ رسول الله، أما بعد!

سنت اپنے باطنی اور روحانی پہلو کے نقطہ نظر سے بھی اسی درجہ اہمیت رکھتی ہے۔ جس درجہ کہ اپنے ظاہری پہلو کے لحاظ سے ظاہری پہلو سے جاری مراد اس کے اسناد کی تاریخی استوار ہے۔ اور وہ شے ہے جسے ہم شرعی یا اس کی آئنی وفقہی حیثیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سنت کی پیروی کو اتنا ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس کے بغیر سلامی زندگی کا صحیح مفہوم ہی متعین نہ سکے کیا اسلام تک رسائی حاصل کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریق نہیں کہ ہم اعمال واعادات اور امر ونواہی کے ایک وسیع وعریض سلسلے کو ماننے پ مجبور ہوں جب کہ اس میں بعض نہات معمولی باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو سنت سے ماخوذ وستفاد ہوں یہ مانا کہ آپ ﷺ بہت بڑے انسان تھے۔ لیکن ان کی زندگی کے ہر گوشہ کی تقلید و اطاعت کے کہیں یہ معنی تو نہیں کہ اس کہ اس سے فرد کی شخصی آزادی بالکل ختم ہوجاتی ہے۔

اعتراض کی نوعیت بہت پرانی ہے۔ ہمیشہ اسلام دشمن عناصر نے اسکو دہرایا ہے۔ اور کہا ہے کہ مسلمانوں کے اسباب زوال میں سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ انہوں نے سنت کی اطاعت اور پیروی کی بجائے تشدد اختیار کیا ان کی یہ رائے ہے کہ اسلام کے بارے میں یہ طرز عمل آیندہ چل کے انسان کی حریت رائے بہت بڑی قدغن ثابت ہوسکتا ہے۔ اور معاشرے کے طبعی ارتقاء کو روک دینے باعث بن سکتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہہ دیتے ہیں اس ضمن میں یہ حقیقت جان لینے کی ہے۔ کہ چاہے ہم اس سوال کا تسلی بخش جواب سے سکین یا نہ دے سکیں اسلام کا مستقبل بہرحال سنت لیٔ صحیح صحیح موقف کی تعین کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر سنت کا مقام و موقف سمجھ میں آگیا تو اسلام کی روح کو تاریک بنا دینے کے زمہ دار قرار پاییں گے۔ ہمیں بجا طور پر ناز ہے کہ اسلام دوسرے ادیان کیطرح متصوفانہ اذعان کا قائل نہیں بلکہ اس کے دروازے ہمیشہ بحث و تمحیص کے لئے کھلے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم صرف یہ معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے کہ سنت نے کن چیزوں کو ہمارے لئے ضروری ٹھہرایا ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ معلوم کرنے کا حق رکنتے ہیں۔ کہ اس کی تہہ میں کیا اسباب و علل کارفرما ہیں۔ اسلام کا مزاج ایسا ہے۔ کہ توحید کو صرف عقیدہ تک محدود نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ چاہتا ہے کہ زندگی کے تمام گوشے اسی رنگ میں رنگے جایئں۔ اور عقیدہ فکر کے دائروں سے نکل کر اس کے تسلط واقتداء کے دائرے عمل وحرکت کے ایک ایک حصہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔ پھر چونکہ اس مقصد جلیل تک پہنچنے کا تنہا ہی راستہ ہے۔ اس لئے قدرتا اس کی آغوش میں تمام مدکات آگے ہیں۔ اور اس جامعت کے ساتھ نہ تو رتی بھر اضافہ ممکن ہے۔ اور نہ یہی ہوسکتا ہے کہ ان میں زرہ برابر بھی کمی کر دی جائے۔ انتحا بیت

اور پسند کو اس میں دخل نہیں جب ہم نے ان تعلیمات کو تسلیم کرلیا۔ جن کو قرآن کریم نے ہم تک پہنچایا ہے۔ یا آپ ﷺ کو رسالت تک ہماری ان تک رسائی ہوئی ہے۔ تو ہمارے لئے ضروری ہوجاتا ہے۔ کہ ان کو پورا پورا مانیں بغیر کسی استثناء کے سب کی عقا بیت پر ایمان لایں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ اپنی اصل قدر و قیمت اور افادیت کھودین گی۔ اسلام کے بارے میں یہ اصولی اور بنیادی سی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ کہ یہ چونکہ عقل و دانش کی اہمیتوں کو مانتا ہے۔ اا س لئے اس کی تعلیمات کے ردو قبول میں ہر شخص مختار ہے، ۔ کہ جس جس کو حصہ معقول سمجھے۔ مان لے۔ اور جس کو معقول اور دانش کی کسوٹیوں پر پورا اترتا ہوا نہ دیکھے ترک کردے۔ یہ غلط فہمی اس بنا پر ابھری کہ لوگ موجودہ عقابت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ موجودہ عقلیت اور چیز ہے۔ اور نفس عقل شے دیگر عقل کا کام ایک طرح کی نگرانی ہے جہاں تک دینی تعلیمات کا تعلق ہے۔ اس کے دائرہ فرائض میں صرف یہ بات داخل ہے۔ کہ یہ دیکھے کہ جو کچھ اس پر مذہب کی طفف سے عئد کیا جا رہا ہے آیا اس کو یہ آسانی سے برداشت کرسکتی ہے۔ بغیر اس کے کہ یہ فلسفہ کے چکروں میں پڑے اور اس کی سحر طرازیوں سے متاثر ہو اسلام سے متعلق عقل و دنش کا بے لاگ فیصلہ یہی ہے جس کا اظہار کئی مرتبہ ہوچکا ہے۔ کہ یہ اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ لیکن اس کا یہ ہرگز معنی نہیں کہ جو شخص اسلام سے لگاؤ رکھتا ہے۔ وہ اس کی تعلمیات کو ماننے پر خواہ مخواہ مجبور ہی ہے۔ یہ تو اس شخص کی مزاج طبعیت پر موقوف ہے۔ اور یا بالآخر روھ و باطن کی بیداری اور قلب و ضمیر کی روشنی و ہدایت کا قصہ ہے۔ وہ اس کو تسلیم کرتا ہے۔ یا نہیں اتنا البتہ صحیح ہے۔ کہ جس شخص کا بھی دامن تعصبات سے پاک ہے وہ اس کی تعلیمات کو عقل و حکمت کے تقاضوں کے خلاف نہیں ٹھرا سکتا۔ رہی یہ بات کہ اسلام کی بعض حقیقتیں اس کو فہم و ادراک کی معمولی سطحوں سے اونچی نظر آتی ہیں۔ تو یہ ممکن ہے مگر اس کو تناقض نہیں کہیں گے۔ عقل اور فلسفہ عقلیت کے فرق کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ ان کے حدود فرائض کیا ہیں۔ مذہبی امور میں عقل کا فریضہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ آلہ تسجیل کی طرح ہر ہر معاملہ میں جو پیش آئے۔ ہاں یا نہ کو مثبت دے اور بس جب کہ عقلیت حیثیت پر قانع نہیں۔ یہ اس سے بڑھ کر خیال آرائی کے میدانوں میں قدم زن ہوتی ہے۔ پھر صرف عقل کی طرح اس کی حیثیت ایک مستقل بالذات اور منفرد و ظہور کی بھی نہیں۔ بلکہ یہ سراسر موضوعی اور مزاج سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ عقل تو اپنے حدود کو پہچانتی ہے۔ مگر عقلیت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا یہ ادعا ہے کہ تمام عالم اور اس کے اسرار و رموز اس کی انفرادی جھپٹ میں آتے ہیں۔ اگرچہ فی الواقع اس کا دائرہ درجہ تنگ ہے ایک مین تضاد عقلیت میں یہ بھی ہے کہ یہ ماموردین میں ت ولیسے حقائق کو مان لینے پر آمادہ نہیں جو فکر و اندیشہ کی گرفت میں آنے والے نہ ہوں لیکن جب معاملہ علم کا ہو تو پھر اس کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ پھرنا پیداکنار ہے۔ اور کوئی ضروری نہیں کہ اس کی تمام پہنایئاں انسان معلوم کر ہی لے۔ عقلیت یا فلسفہ عقلی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد ہی ایک بڑا سبب ہے۔ اعاد و انکار کا اسی سبب سے بہت سے عصری مسلمانوں نے آپ ﷺ پر ایمان لانا غیر ضروری سمجھا لیکن ہم یہ کہہ دیتے ہیں کہ حد سے بڑھا ہوا اعتماد صحیح نہیں بات اتنی واضح اور عقلیت کی لئے چارگی اس درجہ مسلم ہے۔ کہ اس کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کہ کانٹ عقلیت کے قلعے پر یہ کہہ کر ایک دفعہ پھر حملہ کرے کہ عقل کی پرواز حدود فضائوں میں ہی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ جہاں تک دماغ و فکر کی افتاد و مزاج کا تعلق ہے۔ کہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کارخانہ ہست و بود میں جو ایک طرح کی کلیست جاری و ساری ہے۔ اس کی حقیقت و کہنہ کو معلوم کرسکے۔ ہم جو کچھ معلوم کرسکتے ہیں وہ صرف تفصیلات و عوارض یں از بست و لا نہایت تک ہماری رسائی نہیں ہوسکتی۔ مزید براں ہمارے علم کی رسائی کا یہ حال ہے۔ کہ ہم اب تک یہ بھی نہیں جان پائے کہ خود یہ طلسم زندگی کیا ہے۔ دینی عقائد کے معاملے میں جو کہ فوق الادراک بنیادوں پر قائم ہیں۔ ہمیں ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ جس کی عقلی صلاحیتیں فلسفہ مادی کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ہوں اور عمومی و موضوعی عقل سے کہیں بڑھ اس کی خوبیاں ہوں جس سے کہ ہم سب بہرہ مند ہیں دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہمیں ایک پیغمبر کی ضرورت ہے اگر ہمیں قرآن کے بارے میں یہ یقین ہے۔ کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور آپ ﷺ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے۔ تو صرف اخلاقی نقطہ نظر سے بلکہ عقلا بھی ہم مجبور ہوجاتے ہیں۔ کہ آپ کی رہنمائی پر آنکھیں بند کرکے ہم بھروسہ کریں۔ بند کرکے بھروسہ کرنے کے معنی یہ نہین کہ ہم غور و فکر کی صلاحیتوں سے دست بردار ہوجایئں بلکہ اس کے برعکس اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا بہترین استعمال کریں۔ اور آپ ﷺ کے اوامر نواہی کے پیچھے جو معانی و حکمت پہناں ہیں ان کا کھوج لگانے کی پوری کوشش کریں۔ چاہے ہم اس کھوج اور تفحص میں کامیاب ہوئیں۔ یا نہ ہوسکیں ناکامی کے بعد بھی اطاعت ہر حال ضروری ہے۔ اس کو ایک سپاہی اور فوجی کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرض کیجئے کہ سپہ سالار عسکر نے اسے ایک خاص اہمیت کی جگہ پر قبضہ کرلینے کا حکم دیا ہے اس صورت میں اس فوجی کا یہ فرض ہے کہ فی الفور اس جگہ کو گھرے۔ پھر اگر حکم کی اس تعمیلکے ساتھ ساتھ اپنے افسر کے اس حکم کی جنگی اہمیت کو بھی سمجھتا ے تو یہ اس کے لئے اور فوج کے لئے بلاشبہ خوش آئند ہے۔ لیکن اگر اس کی جنگی قدر قیمت اس کی سمجھ میں آئی تب بھی تعمیل حکم اس پر لازم ہے اور اس کو یہ اخیتار ہرگز حاصل نہیں ہے کہ اس یں ردوقدح کہ لے یا اس کو ٹالی جائے ہم مسلمانوں کا آپ ﷺ کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عقیدہ ہے کہ آپ اس عسکر اسلام اور سپاہ ایمان کے بہترینا ور کامیاب ترین سالار و قائد ہیں اور امور دین کے اجتماعی و روحانی پہلوں کو اس سے کہیں اچھی طرح سمجھتے ہیں جتنا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں۔ لہذا جب آپ ہمیں کوئی حکم دیں گے۔ یا کسی معصیت سے روکیں گے تو ہم لامحالہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ انسانی اصلاح کے لے بہر حال ایسا حکم دینا ناگزیر ہے اور اس میں روھانی اجمتاعی پہلوں کو ملحوظ و مرعی رکھا گیا ے ہ یہ ممکن ہے کہ یہ پہلو کبھی تو بالکل واضح ہوں اور

کبھی ان میں وضوع کی مقدار بالکل کم ہو اور اس شخص کی گرفت میں نہ آسکیں۔ جن کو کہ دینی امور میں زیادہ مہارت نہیں اسیطرح کبھی کبھی تو آپ ﷺ کے احکام و اوامر میں جو گہری حکمت پوشیدہ ہے وہاں تک انسانی فہم کی رسائی ہوجاتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صرف سطحی اسباب حکم تک ہی نظر و بصر کے دائرے پھیل کے رہ جاتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اطاعت فرمانبرداری کے سوا چارہ نہیں بشرطیکہ ان احکام کا ثبوت مستند ہو پھر ان احکام و اوامر کی ایک تقسیم اہم اور نسبت کم اہم کی بھی ہے۔ اس صورت میں ہمارے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے۔ کہ ہم کو ترجیح دی جائے لیکن کسی حکم کو بھی اس کگمان فاسد کی بنا پر چھوڑ دینا روا نہیں کہ اس میں کوئی بنیادی اہمیت دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ آپ ﷺ سے متعلق قرآن میں صراحتا آیا ہے۔۔۔۔ قرآن۔۔۔۔۔ (نجم) وہ کوئی بات بھی اپنی طرف سے کہنے کے مجاز نہیں۔ اس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ اس وقت تک کوئی کلمہ نہیں کہتے ہیں جب تک کہ اس کی کوئی مثبت وجہ سامنے نہ آجائے اور یہ کہ جب تک اللہ تعالیٰ اس پر آپ ﷺ کو مامور نہ فرمائے۔ یہ ہے سبب جس کی وجہ سے تالب وتلب دونوں لحاظ سے ہم سنت کی پیروی پر مجبور ہیں بشرط یہ کہ ہمارا نقطہ نظر اسلام کے بارے میں مختلف نہ ہو پھر جب پیروی سنت کے ایجابی تقاضے ابھر کر سامنے آگئے تو ایہ ہر مسلمان کےلئے ضروی ہوگیا کہ سنت نے اسلام کی جس اجماعیت کی تشکیل کی ہے اس کے حکم اسرار پر غور کرے۔ اور یہ بتائے کہ اس تفصیلی نظام حیات کے اندر کیا روح کارفرما ہے۔ جس کو مسلماں ولادت سے لے کر موت تک کہ تمام لمحوں میں ملحوغظ رکھتا ہے اور جس پر کہ عمل پیرا ہونا اس کےلئے ضروری ہے۔ اس نظام حیات میں وہ مسائل بھی داخل ہیں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اور وہ بھی جنھیں بظاہر کوئی اہمیت نظر نہیں آتی مسلمان کو اس حقیقت کا کھوج لگانا ہوگا کہ آپ ﷺ نے یہ ہر بات میں اپنے اسوہ حسنہ کی پیروی اطاعت پر کیوں زور دیا ہے مثلا اگر میرے دونوں ہاتھ صاف ہیں تو بایئں ہاتھ سے کھالینے میں کیا مضائقہ ہے یا داڑھی رکھ لینے اور منڈا ڈالنے میں کیا فرق ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ایسے نہیں کہہ جن کا تعلق سراسر صورت وقالب سے ہے کیا ان مسائل کا تعلق انسانی رترقی سے ہے اور اس سے معاشرہ کی فلاح و بہبودی میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اس مرحلہ پر ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ان سوالات کا متعین جواب دیں کیونکہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہا سلام کی ترقی انحطاط کا دارومدار آپ ﷺ کی پیروی پر ہے۔ اگر پیروی اطاعت موجود ہے تو ترقی پائی جائے گی اور اگر بد قسمتی سے اطاعت فرمانبرداری کا داعیہ کمزور ہے تو اسی نسبت سے انحطاط و تنزل کا پش آنا لازمی ہے۔ ہمارے نزدیک ہر معمالہ میں سنت کی پیروی کی اہمیت کئی وجود سے ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح انسان کی عادات واطور کےلئے ایک سانچہ مہیا ہوجاتا ہے اور ہر ہر شخص ایسی زندگی بسر کرتا ہے جس میں شعور کرفرما ہے بیداری جلوہ گر ہے اور ضبط نفس نمایاں ہے وہ کام اور اعمال اور افعال جن کی تہہ میں کوئی قاعدہ اور ترتیب نہ پائی جائے فکر و روح کی ترقی میں روکاوٹ ثابت ہوجاتے ہیں لہذا ایسے تما اعمال وفعال کی مقدار انسانی زندگی میں ممکن حد تک کم ہونا چاہییے کیونکہ ان سے فکر و روح کا ارتکاز تباہ ہوجاتا ہے اور وہ اس لائق نہیں رہتی کہ اپنی صلاحتیوں کو کسی ایک مکز پر مجمع کرسکے اس لے ہم جو قدم بھی اٹھایئں اور جو کام بھیکریں اس کو ہامرے شعور ارادہ کے مطابق ہوناچیے اور اس پر اخلاقی نگرانی جارہی رہنا چاہیے ی مگر یہ اسف وقت تک ہونے والال نہیں جب ت ک ک ہم اپنے فکر و شعور کی جنبشوں کا محاسبہ کرنا نہ سیکھیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اعمال کی اس حقیقت کو اس جامع نانع جملے میں نہایت کامیابی سے ادا فرمایا ہے۔ **اسبوا نفسکم قبل ان تحاسبوا** اس سے پہلے اپنے محاسبہ نفس سے فارغ ہوجاؤ کہ عند اللہ تمہارا محاسبہ ہو اس سے پہلے ہم اشارۃ بتا چکے ہیں کہ اسلامی نظریہ عبادت صرف عبادات ہی کو اپنے آغوش میں نہیں لیتا ہے۔ بلکہ اس میں ہماری پوری زندگی کا انعکاس ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہماری ذات کے روحانی و مادی دونوں پہلوں میں ایک طرح کی وحدت پیدا ہوجائے اگر یہ صحیح ہے توف حیات انسانی میں ان تمام عوامل کو حتی المقدور کم ہونا چاہییے جن میں شعور و ضبط نفس کے عناصر کا فقدان ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب محاسبہ و نگرانی کہ اس عمل کو ہم جاری رکھیں یہ اس سلسلہ کا پہلا قدم ہے۔ اور وہ یقینی راستہ ہے کہ جس سے ہم ضبط نفس کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں اگر ہم روز مرہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں سنت کی پیروی کا خیال رکھتے ہیں۔ اور مادۃ ہمارا قدم اسی سمت اٹھتے ہیں۔ تو یہ چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی ہی اہمیت کے ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان سے محاسبہ نفس اور ضبط و نگرانی کے ذریعے ہمیشہ بیدار رہتے ہیں رہے بڑے سے بڑے کام تو ان کے متلق تو شعور کی بیداری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہ تو شعور کے بغیر صادر ہو ہی نہیں سکتے۔ شور و ادراک کا دامن تو اس وقت چھوٹتا ہے جب چھوٹے چھوٹے ناقابل التفات کامون کا سامنا ہو اس وقت یہ عموما ہو کرہتے ہیں۔ اور ذہن و رفکر کو غافل رکھتے ہیں ہاں اگر ان حقیر اور کم ردرجہ کے اعمال میں بھی مراقبہ وضبط کی عادت قائم رہتی ہے تو ہر انکی منفعت دوچند ہوجانے میں کیا شوبا بظاہر واقعی اس بات میں کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی کہ ہم کس ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ دایئں ہاتھ سے یا بایئں ہاتھ سے ہم نے داڑھی بڑھا رکھی ہے۔ یا منڈا رکھی ہے۔ لیکن اگر ہمارے اعمال میں ایک تعظیم رونما ہے ہم ایک خاص سانچہ میں اپنی عادات کو ڈھالنے کے عادی یں تب انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ مسلسل ضابط و ترتیب کا خیال رکھنا اور اپنے کو قواعد و پابندیوں میں بندھا ہوا محسوس کرنا آسان نہیں اگرچہ انسان اس طرح کی خاص تربیت پائے ہوئے ہو وجہ ظاہر ہے ذہن انسانی بھی اس طرح کسل تساھل کا عادی ہے۔ جس طرح کے انسانی جسم و عضلات ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ اگر آپ کسی

ایسے آدمی کو پیدل چلنے کی ذحمت دیں گے ۔ جواپنے گوشہ عافیت میں پڑے رہنے کا عادی ہے ۔ جو کبھی چلا پھرا نہیں تو وہ چند ہی قدم چل کر تھک جائے گا۔ اور ایک قدم آگے نہیں بڑھا پائے گا۔ بخلاف اس کے کہ جو میلوں چلنے کا عادی ہے اس سے توقع کی جاسکتی ہے ۔ کہ وہ طویل سے طویل سفر کو بغیر کسی زحمت کے جاری رکھ سکے گا یہ بھی اگرچہ سفر کی کوفت محسوس کرے گا لیکن ٹھرائے گا نہیں بلکہ ایسا معلوم ہوگا اس کوفت میں بھی لذت کا ایک پہلو پایا جاتا ہے ۔ اور یہ اس سے مانوس ہے ۔ یہ فلسفہ سنت کی ہمہ گیریوں کا اور یہ دوسی تعطیل ہے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے ۔ کیونکہ سنت زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے ۔ جب ہم اس طرح مسلسل مشق و تمرین سے اپنے تمام اعمال و مروکات کو امر او نہی کے خانوں میں تقسیم کردیں گے ۔ تو اس کا لازمی تیجہ یہ ہوگا ۔ کہ نفس شعور میں ضبط و انضباط کے دواعلیٰ راسخ ہوجایئں گے ۔ اور زندگی کا ی نہج طبعیت ثانیہ بن جائے گا۔ یہی میں اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ جس نسبت و مقدار سے محاسبہ کی مشق و تمرین کا یہ سلسلہ دراز ہوتا جائے گا اسی نسبت سے اخلاقی وذہنی کسلمندیاں کم ہوتی چلی جایئں گی اور ہم اخلاق و آداب کی منزلوں کے زیادہ قریب ہوتے جاوے گے ۔ مشق و تمرین کا لفظ چاہتا ہے کہ اس کی تہ میں شعور اور احساس کا جذبہ ہمیشہ کارفرمارہے کیونکہ اگر عمل بالغۃ کی سطح سے اس حد تک آگرے کہ ہماری تمام زندگی مکان کی ہو کررہ جائے اور بے جان مشینری کی طرح انزمات و منہیات کا علمیہ جاری رہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے ۔ کہ سنت نے اپنی قدر و قمیت کھو دی اور روح ختم ہوگئی جو مقصود اصلی تھی ۔

آپ ﷺ کے بعد آخری دور میں کیا ہوا یہی نا کہ ظاہر سنت تو قائم ہے اور ان کا چرچا بھی ہوا مگر ان کے ساتھ جو احساس مھاسبہ اور جذبہ نگرانی وابستہ تھا ہو جارتا رہا صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کی زندگیان اس انازکی نہ تھیں ان کی پیروی سنت کا مطلب نہ تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو جان بوجھ کر اور شعور وادراک سے مالامال ہو کر ایک ہادی اور رہمناک سپرد کردیا تھا تاکہ وہ ان کے اعمال کی سمتوں کو قرآن کی طرف پھر دے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سنت کی پیروی سے فواہد حاصل کیے جو دوسرے نہیں حاصل کرسکے اور اس میں خطا اس نظام سنت کی نہیں ان کے لیئے وضع کے گئے تھے عمل بالسنۃ کی اہمیت کو ختم کرنے والے عوامل میں پلا بمبر تصوف کا ہے اس نے ان قوتوں کو ک زور کیا جن کا تعلق انسنی فعالیت سے ہے اور ان صلاحیتوں کو چمکایا جن کا تعلق انسان کی داخلی تاثریزیوں سے ہے ۔ عمل بالسنہ کو عملی زندگی میں ختم کردینا تو تصوف کے لیئے اس بناء پر ممکن نہ تھا کہ ابتداء ہی سے اس کو اسلامی زندگی میں ایک بنیادی عنصر کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ لیکن صوفیائے عظام کی کوششوں سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا مزاج ار رخ یکسر بدل گیا۔ اور یہ بجائے ایک فعالی قوت و ھڑکت ہونے کے مضح افاطونی رمزیت ہو کرہ گیا۔ فقہا او عالمۃ الناس کے نقطعہ نظر سے بھی اس کو گرتد پہنچا ہے ۔ کیونکہ فقہاء نے سنت سے یہ مراد لیا کہ یہ محض ایک قانون ہے ۔ اور سلسلہ ضوبط سے تعبیر ہے ۔ اور عوام نے یہ خیال کیا کہ ایک خوبسور تسرف ہے جو معنی کے در سہوا سے بالکل نہی ہے ۔ لیکن تعیب اس پ ہے کہ مسلمانوں کے تمام گروہوں نے اگرچہ قرآن اور اس کی ان تعبیرات و تشریہات کما حقہ استفادہ نہیں کیا جو سنت میں مذکورہ ہیں تاہم اسلامی تعلیمات کا وہسرچشمہ جو سنت سے فیضیاب ہوتا ہے جوں کا توں قایم رکھتا ہے اور اس میں عملی دشواری حائل نہیں کہ اس کی طرفدوبارہ رجو کیا جاسکے ۔ پھر سنت جیسا کہ مغرب زدہ معاندین اسلام سمجھتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کی کوششوں سے ہم تک نہیں پہنچی ہے ۔ جو فریسیوں کی طرح الفاظ پرست اور جامد ہوں بلکہ یہ ان لوگوں کی مساعی جمیلہ کا نسخہ ہے جو بلا کی شعور رکھتے تھے جن مین غضب کی عزیمت اور کھری بصیرت و عمل کے واعی موجزن تھے اس کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کو دیکھو ان میں یہی صفات تھیں جو ان کطرہ امتیاز یسان کو تاریخ میں حیرت انگیز کامیابی کیوں نصیب ہوئی اسی بنا پر کہ ان میں ہمیشہ ذہنی شعور زندہ رہا یہ سنت کی ایک جزئی میں جو حکمت پوشید ہے ۔ اس سے باخبر رہے اور ان زمہ داریوں سے آگاہ رہے جو مذہب نے ان کے کندھوں پر ڈالیں ۔ سنت کی اہمیت کا یہ ہے انفرادی پہلو۔

دوسری وجہ جس سے کہ عمل بالسنۃ کا فلسفہ واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کی برکت سے اجتماعی زندگی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور اجمتاعیخیر و فلاحکا ایک نقشہ ترتیب پاتا ہے کبھی آپ نے غور کیا عام انسانوں میں اختلاف کا کیا سبب ہے اور یہ کیو نکر بڑھتا اور فروغ پاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ چونکہ ہر شخص کے دل میں دوسروں کے اعمال مقاصد بارہ میں ایک طرح کی غلط فہمی پائی جاتی ہے ۔

اس لیئے کوئی بھی ایک دوسرے کو سمجھانے کی سعی نہیں کرتا اور یہ غلط فہمی کیوں پیدا ہوتی ہے ۔ اس لیئے کہ ہر ہر شخص کے مزاج و طبیعت کا یہ قدرتی اختلاف صرف معمولیا ختلاف میں پیدا نہیں کرتا بلکہ اس سے ہر قوم کی عادات و اطوار کے مگطابق زندگی بسر کرتے کسی قوم پر ایکعرصہ گزر جاتا ہے تو یہی عادات و اطوار کا اختلاف تہذیب و تمدن کا اختلاف بن جاتا ہے ۔ اور باہمی اتفاق و اتھاد کی راہ میں رکاوٹثابت ہوتا ہے پھر اگر کوئی قوم یہ فیصلہ کرلیتی ہے ۔ کہ اس کی زندگی یماایک اہم آہنگی پیدا ہوجائے اور اس کی عادواطوار اور تہزیب و ثقابت کا ایک متعین قالب تیار ہوجائے تو ان میں باہمی اختلاف ختم ہوجاتا ہے اور یہ صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے ۔ کہ یہ ایکدوسرے کے اعمال و مقاصد کو اچھی طرح سمجھ سکیں ۔ اس بناء پر

اسلام نے جوانفرادی بہبودی کے ساتھ ساتھ اجتماعی فلاح کا بھی ضامن ہے ۔ اپنی تعلیمات مین اس نکتہ کو ینادی ٹھرایا کہمعاشرہ کے تمام افراد میں عادات واطوار کی کامیابی پائی جائے ۔ اوران میں سنت کے التزام سےایسے کوائف بیدار ہوجایئں جرہر حال یسان کے تہذیبی و دینی اتحاد کو برقرار رکھیں چاہے ان کے اجتماعی و اقتصادی حالات ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف اورجداکیوں نہ ہوں یہ سچ ہے کہ بعض لوگ سنت کے اس نظام میں ایک گونہ سختی اور تشدد محسوس کریں گے لیکن اس کی ااس خدمت کو کون بھلاسکتا ہے ۔ کہ اس نے اسلامی معاشرہ کواستحکم بخشا ہے ۔

اس کوایک متعین شکل اورصورت میں ڈھالا ہے ۔ اور ہر ہر نزاع و اختلاف کی مضرتوں سے بچایا ہے ۔اس کی اس افادیت کو سمجنے کےلئے ان انقلابات پر غورکیجئے جو مغرب میں معاشرتی اصلاحات کے نام سے وقع پزیر ہوئے اورایسا ہوناضروری بھی تھا کیونکہ اس طرح کے مسائل کسی قوم میں اس وقت پیدا ہوتے ہیجب لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمارے بعض قوانین اوررسم رواج مکمل نہیں ہیں ۔ اس لئے ان میں کچھ تبدیلیاں ہونی چاہییں ۔ اہل مغرب نے چونکہ اپنے ہاں ان نقائص کو پالیا اس لئے اصلاح کے درپے ہوئے مسلمان اس سورت ھالات پراس بناء پر محفوظ رہے کہ یہ اہنے آپ کو قرآن کا پابند ٹھراتے ہیں اوراس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہامرے تمام اعمال آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مطابق ہونے چاہییں ۔ یہ اصول اپنی جگہ ایسا مستحکم اوراستوار ہے کہ ااس کواپنانے کے بعد تبدیلی و تفسیر کا سوال پیدا نہین ہوتا ۔ مگریہ کہ خودیہ اصول ہی شک وریب کا نشانہ بنے ۔ اوران کی صداقت ہی محل نظر قرار پائے اس سے ہم مسلمانوں مین اتحادواتفاق کے اس امکان کو عملانافز ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس کو بنیادمرصوص کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے اورف گرہم اصول کوپوری طرح حرزجان بنالیں تومعاشرہ ان تمام بے کاراوطائل کوششوں سے بے نیاز ہوجاتا ہے ۔ جوفروعی مسائل کےلئے کی جاتی ہیں ۔ پھر اگر معاشرہ ان اختلافات سے بازف آئے جسکوجدل وبحث کے تقاضوں نے پیداکیا ہے اوراس پریشانی خاطر سے دستکش ہوجائے ۔ جس کو کہ کلامی موشگافیوں نے جنم دیا ہے ۔ اوراس کے بعداس کی بیادکتاب وسنت کی پیرری پر رکھی جائے توایسے مواقع نکل آیئں گے کہ معاشچرہ اپنی تمام صلاحیتوں کوافراد کی اجتماعی و نفاردی فالح و بہبودی کےلئے استرعمال یملائیں یہی نہیں بلکہ معاشرے کےلئے یہ بھی ممکن ہوجائے گا ۔ کے تمام افراد کے روحانی ارتقآئ کےلئے مورجدوجہد ک سکے انسانی معاشرہ کی تنظیم و اصلاح کا یہی وہ نصب العین ہے جو اسلام کی اصلی غرض و غائت ہے آیئے ۔ اب عمل بالسنۃ میں جوتیسری بڑی مصلحت ہے اس پر غورکریں ۔ یہ توظاہر ہے کہ ہم جب سنت پر عمل کی زمہ داری کو قبول کریں گے تواس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی آپ ﷺ کی اقتدائ کو پش نظر رکھیں گے ۔ اوراس کا تیجہ یہ ہوگا کہ ہم عمل کی ہر ہر صورت میں چاہے وہ اخیتار پر مبنی ہوچاہے ترک پر ۔ آپ ﷺ کی عملی زندگی پر غورو کر کرنا کی عادت ڈالیں گے کیونکہ ہمیں اپنے تمام اعمال کا جائزلینا ہے اور اپنی زندگی میں نہ دیھنا ہے کہ آپ ﷺ کی اطاعت و پیروی کا مقصد پورا ہورہا ہے ۔ یا نہیں ۔ اس طرح گویاایک عظیم ترین انسانی شخصیت کواثر نفوظ کوہمارے روزمرہ کے مشاغل میں منعکس ہونے کا موقع یسر آئے گا بلکہ یہی وہ روھانی اثر نفوذ ہوگا جو ہماری زندگی کی سٹینزی کو متحرک رکھے گا ۔ اس کا یہ فائدہ ہگا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پرہم یہ رائے رکھن پر مجبور ہوں گے ۔ کہ علاوہ اس کے آپ ﷺ اللہ کے محبوب ترین اخلاقی پیغمبر ﷺ ہیں آپ ﷺ ایک مکمل زندگی بخشنے والے بھی ہیں اس مرحلہ پرجب کہ عمل بالسنۃ کی یہ فصلاختام و پہنچ رہی ہے ہمیں اس بات کا فیصلہ بھی کرلیناچاہیے کہ ہم آپ ﷺ کے منصب و موقف کے بارے میں کیارائے رکھتے ہیں ۔ کیا ہم انہیں دوسری مصلمین وحکم ای طرہ صرف ایک حکم مصلح اور فلسفی ہی سمجھتے ہیں ۔ یا اللہ کا ایسا فرستادہ خیال کرتے ہیں کہ جو ہرآن وحی والہام کی روشنی میں اسی کی اطعت وپیروی میں مصروف ہے جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا نقطعہ نظراس سلسلہ میں بالکل واضح ہے اوراس میں کسی غلط فہمی کے ابھرنے کا امکان ہی نہیں کہ اللہ کا یہ بندہ جس کو نبی آخرالزمان ﷺ قرار دیاگیا ۔ ۔ اورجس کو تمام جہانوں کےلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے ۔ اس کے سوااورکچھ ہوہی نہیں سکتا ۔ کہ صبح شام زندگی کے ہر عمل میں اللہ کی وحی اس کے قلب و فکر کوروشنی بخشنے اوریہ وحی ہدایت کے ان انور سے اس کے بندوں کےلئے اجالوں کا بندوبست کرے ۔ اگرآپ ﷺ کے متعلق یہ وضاحت صحیح ہے ۔ تواس کا انکاریااس کی تعلیمات کے بعض حصوں کا انکار رہوایاکم ازکم اس کا یہ مطلب ہواکہ اس کی عطاء کردہ ہدایت کی قدرقیمت گھٹادی گئ ہے ۔ اوراگر یہ وضاحت درست نہیں ہے ہم اس خیال کو منطقی طورپر آگے بڑھاتے ہیں ۔ اورکہتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کوئ آخری فیلہ نہیں ہین ۔ اور موجودہ مسائل و مشکلات کا کوئی دوسرا معقول حل بھی سوچاہاسکتا ہے تویہ خیال اوجن نتائج کی طرف بھی لے جائے ممکن ہے ۔ اسلام کی روح بہرحال اس سے متفق نہیں ہوسکتی ۔ کیونکہ قرآن نے اس معاملے میں دوٹوک رائے کا اظہار فرمایاہے ۔ ۔ ۔ قرآن ۔ ۔ ۔ ۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارادین مکمل کردیا ۔ اوراپنی نعمت اتمام حجت تک پہنچادی ۔ اور تمہارےلئے ادیان میں اسلام کوپیروی و اطاعت کےلئے چن لیا ہم اسلام کو تمام تمدنی تنظیمات سے بلنداوراونچامانتے ہیں کیونکہ یہ پوری زندگی سے تعرض کرتا ہے اس میں دنیا کی گھتیوں کو بھی سلجھایا گیاہ ۔ اور عقبیٰ کی پیچدگیوں کو بھی اورنفس روح کے مسائل بھی اس کی لپیٹ میں آتے ہیں ۔ اورجسم ک تقاضے بھی فردکی زندگی کا نقشہ بھی کھینچتا ہے ۔ اوراجتماعی زندگی کی تشکیل بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ۔ یہ صرف اس سے بحث نہیں کرسکتا ۔ کہ انسان کومادی و طبعی قیود سے آذادی دلائے ۔ بلکہ ان مادی و طبعی قیود کا خیال بھی رکھتا ہے ۔ یہ انسان سے محالات کا مطالبہ نہیں کرتا

بلکہ اس کا تقاضا صرف اس حد تک محدود ہے۔ کہ انسان میں جس قدر صلاحتیں مضمر ہیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ایسی سطح تک پہنچنے کی جدوجہد کی جائے جو حق سے قریب تر ہے جس میں رائے اور عمل میں کامل ترین توفیق ہے اسلام صرف ایک راہ نہیں بلکہ تنہا یہی راہ ہے جو حق وصواب کی طرف لیجانے والی ہے اور جو شخص اس دعوت کو لایا ہے وہ صرف ہادی نہیں بلکہ تنہا وہی ہادی ہے پس اس کی اطاعت عین اسلام کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت روگردانی حقیقت اسلام سے روگردانی کے مترادف ہے۔ (الاعتصام لاہور حجیت حدیث)

هذا ما عندي والله أعلم بالصواب

[فتاویٰ علمائے حدیث]

جلد11ص318-331

محدث فتویٰ